بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اینگلو امریکن بلاک کی روایتی اسلام دشمنی اور روس کی بروقت غداری سے مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل کے ہاتھوں مسلمانوں کا جو زبردست نقصان ہوا ہے، اُس کی داستان اتنی دلفگار اور المناک ہے کہ الفاظ اُسے بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلام دشمن طاقتیں برسوں سے اپنے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف ناپاک عزائم پال رہی تھیں اور اس غرض سے وہ بڑی دیر سے ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت ایسے حالات پیدا کر رہی تھیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں اسلام اور مسلمان یکسر نیست و نابود ہو جائیں۔ چنانچہ یہ جو کچھ ہوا ہے اسے کسی وقتی اور اتفاقی حادثے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے پروگرام کے تحت عمل میں لایا گیا۔

مغرب کے نصاریٰ صلیبی جنگوں ہی سے اسلام کے خلاف اپنے دلوں میں ایک شدید نفرت رکھتے چلے آ رہے تھے اور انہیں مسلمان فاتحین، خصوصاً سلطان نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ کے ہاتھوں جو شکستیں کھانا پڑی تھیں اُن کا انتقام لینے کے لیے مناسب مواقع کی تلاش میں تھے۔ جب تک مسلمان دنیا کی ایک ناقابلِ تسخیر قوت رہے اس وقت تک تو یہ لوگ دبک کر بیٹھے رہے لیکن جونہی وہ زوال کے شکار ہوئے ان اسلام دشمن طاقتوں نے ان کو زک پہنچانے، انہیں تباہ و برباد کرنے اور انہیں دنیا سے مٹانے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

جنگِ عظیم اوّل سے پہلے شمالی عرب پر عثمانی حکومت کا قبضہ تھا۔ شام، عراق، لبنان اور

فلسطین ترکی کے ماتحت تھے۔ برطانیہ نے سب سے پہلے تو عربوں اور عثمانیوں کے درمیان دشمنی کی آگ بھڑکائی اور خود عربوں کا مونس اور غمخوار بن کر انہیں عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ پھر جنگ میں جب جرمنی کو شکست ہوئی اور ترکی جو اس کا ہمنوا تھا اُس کی کمر بھی ٹوٹ گئی تو برطانیہ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنتِ عثمانی کے حصے بخرے کر دیئے۔

برطانیہ کی نظر جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے یہودیوں کے مال پر لگی ہوئی تھی۔ اُس نے اُن سے مالی امداد حاصل کرنے کے لیے انہیں اس امر کا یقین دلایا کہ وہ اگر جنگ میں برطانیہ کی بھرپور امداد کریں تو وہ انہیں ایک الگ خطۂ ارضی کے حصول میں مدد دیگا۔ ۱۹۱۸ء میں جنگ کے اختتام پر جب ترک پُورے عرب سے نکل گئے اور فلسطین ایک برطانوی نو آبادی کی طرح برطانیہ کے زیرنگیں ہو گیا تو وہاں ایک صہیونی ریاست کے قیام کے منصوبے بننے لگے اور یہودی تمام ممالک سے آکر اس خطے میں آباد ہونے لگے۔ مگر عربوں کی زبردست مزاحمت کی وجہ سے ان کی کوئی ریاست قائم نہ ہو سکی۔

دوسری جنگِ عظیم نے حالات کا رُخ بالکل بدل دیا۔ یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کی داستانیں سنا سنا کر ایک طرف تو جرمنی کے خلاف جذبۂ نفرت وحقارت اُبھارا گیا اور دوسری طرف یہودیوں کی مظلومیت کا چرچا کر کے اُن کے لیے ایک الگ وطن کے قیام کے لیے فضا ہموار کی جانے لگی۔ ۱۹۴۷ء میں جب برطانیہ نے فلسطین سے حتمی دستبرداری کے بعد اُسے اقوام متحدہ کے حوالہ کر دیا تو جنرل اسمبلی نے صرف دس ہفتوں کے اندر یہ سرزمین عربوں اور یہودیوں کے درمیان تقسیم کر دی۔ عربوں نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن مغربی طاقتیں چونکہ اس خنجر کو مسلمانوں کے سینے میں پیوست رکھنے پر مُصر تھیں اس لیے آخر کار مئی ۱۹۴۸ء میں فلسطین کے ایک بڑے حصے پر یہودی ریاست قائم کر دی گئی۔ عربوں نے تلوار کے زور سے اس غاصبانہ تسلط کو روکنے کی کوشش کی اور آٹھ مہینے تک اس کے خلاف برسرپیکار رہے، مگر مغربی طاقتوں نے یہودیوں کو روپے اور ہتھیاروں سے اتنی مدد دی کہ عربوں کی اُن کے

سامنے کچھ پیش نہ جا سکی اور وہ فلسطین کے آٹھ ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہو گئے۔

یہودی غاصبوں کا مقصد اس جنگ سے صرف اتنا ہی نہ تھا کہ وہ ملک پر قبضہ کریں، بلکہ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ اپنے مقبوضہ علاقے سے عربوں کو نکال باہر کریں اور ان کی جگہ یہودیوں کو لا کر آباد کریں۔ چنانچہ انہوں نے عربوں کے ساتھ ٹھیک وہی کچھ کیا جو نازیوں نے تین چار برس پہلے خود ان کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے عربوں کا بے دریغ قتلِ عام کیا۔ عورت، مرد، بچے، بوڑھے، کسی پر رحم نہ کھایا۔ اور دس لاکھ فلسطینیوں کو، جو صدیوں سے اس علاقے میں آباد تھے، سخت ظلم و ستم کے ساتھ جلاوطن کر دیا۔ مگر یہ عجیب ماجرا ہے کہ جو اہلِ مغرب یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کا دنیا بھر میں ماتم کر رہے تھے، وہ عربوں پر یہودیوں کے بالکل وہی مظالم دیکھ کر ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے، بلکہ الٹے ان کی بہادری پر داد دینے لگے۔ انہیں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ احساس نہ ہوا کہ دس لاکھ عرب اسی بدبخت اسرائیل کی وجہ سے گذشتہ انیس سال سے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ان کے گھربار تباہ ہوئے۔ ان کی عزتیں لٹیں، ان کی زمینیں غصب ہوئیں، مگر جانسن، ولسن یا ان کے پیش روؤں میں سے کسی ایک کے دل میں بھی انسانی ہمدردی کی کوئی لہر نہ اٹھی۔ ان حق ناشناسوں کو کبھی یہ خیال نہ آیا کہ دس لاکھ عرب بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔

پھر مغربی قوموں کا یہودیوں کے بارے میں احساسِ مروت و ہمدردی بھی بڑا عجیب ہے کہ ان کی حالتِ زار پر ترس کھاتے ہوئے انہیں خود اپنے وسیع و عریض مقبوضات میں تو ایک انچ زمین بھی نہ دی مگر انہیں ایک دوسری قوم پر لا کر مسلط کر دیا تاکہ وہ اسے گھر سے بے گھر کر کے اس کی جگہ خود بس جائیں۔ اُن کی نگاہ میں فلسطین بائیبل کی سرزمین ہے اور وہ اسے تاریخی طور پر یہودیوں کا وطن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس سرزمین سے یہودیوں کا آخری اخراج دو ہزار سال پیشتر رومیوں کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ اس وقت سے عرب یہاں آباد رہے۔ چودہ سو سال پہلے جب مسلمان

فلسطین پہنچے تو یہود کا یہاں نشان تک موجود نہ تھا۔ لیکن مغرب کی سامراجی قوتوں کو چونکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید پرخاش ہے اور انہیں صرف انہیں مٹانا مقصود ہے اس لیے انہوں نے اس خنجر کو مشرقِ وسطیٰ کے قلب میں پیوست کر کے چھوڑا اور اب حق و انصاف کے ہر تقاضے کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے وہ اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

مغربی سامراج نے جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے برباد کرنے کے وسیع پروگرام کا ایک ضروری حصہ تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد اہلِ مغرب نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اب ان کے لیے مشرقی ممالک اور خاص طور پر مسلمان ممالک کو براہِ راست اپنی غلامی میں رکھنا مشکل ہے۔ اس کے ساتھ انہیں نئی ابھرنے والی طاقتوں کی طرف سے جو خطرات پیش آسکتے تھے اُن کی نوعیت کا بھی ان کو اندازہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی جب کبھی مسلمانوں کو اسلام کے نام پر پکارا جاتا ہے وہ فوراً سرگرمِ عمل ہو جاتے ہیں۔ اس نام ہی سے ان کے اندر اتفاق و اتحاد پیدا ہوتا ہے۔ مغرب کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے بھی انہیں صرف اسلام ہی نے بیدار کیا اور قوت فراہم کی۔ ان سارے خطرات کو پوری طرح بھانپتے ہوئے مغربی سامراج نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا جو مندرجۂ ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

- مشرقِ وسطیٰ میں، جو دنیائے اسلام کے لیے قلب کی حیثیت رکھتا ہے، اسرائیل کا سرطان پیدا کر دیا جائے۔ مغربی طاقتوں کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اسرائیل اپنے وجود کے لیے ہمیشہ ان کا دست نگر رہے گا اور اس طرح اسرائیل کی حمایت کی آڑ میں ان سامراجی طاقتوں کو مشرقِ وسطیٰ کے مسائل میں براہِ راست دخیل ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔
- کسی نہ کسی طرح اسلام کے مقابلے میں کسی دوسرے نظریۂ حیات کو خود مسلمان ملکوں کے اندر پروان چڑھایا جائے اور اس مقصد کے لیے مغربی الحاد اور اشتراکیت دونوں کو مسلط کرنے کا انتظام کیا جائے۔ جن لوگوں کو مغربی الحاد سے دلچسپی ہوا اور وہ امریکہ برطانیہ

اور فرانس کی طرح مذہب سے بیگانہ ہو کر اباحیت کی زندگی بسر کرنے میں دلکشی محسوس کرتے ہوں اُن کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جائے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی اسی غرض کے لیے کام کر رہی ہے۔ لیکن جو لوگ برطانیہ اور امریکہ کے مظالم کی وجہ سے براہ راست ان کے اثر میں نہ آسکیں اُن کے لیے اشتراکیت کے نسخہ کو آزمایا جائے۔ ان قوموں کا مقصد صرف ایک ہے کہ یہاں کسی طرح اسلام ختم ہو خواہ یہ کام مغربی الحاد کے ذریعہ سے انجام پائے یا اشتراکیت کے ذریعہ سے ——————— اسلام کے معاملے میں امریکہ، برطانیہ فرانس اور روس سب پوری طرح متفق ہیں۔ ایک امریکی اور ایک برطانوی اشتراکیت کو تو گوارا کر سکتا ہے مگر اسلام کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک اشتراکی کے لیے سرمایہ دارانہ الحاد تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے مگر خدا پرستانہ اسلام کو وہ پنپتے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔ مغربی طاقتوں کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اسلام کے ختم ہو جانے کے بعد پھر یہ مسلم حکومتیں خواہ اشتراکیت کی علمبردار بنیں یا سرمایہ داری کی، لیکن ان میں زندگی کی حرارت اور حرکت بالکل ختم ہو جائے گی۔ اس بنا پر وہ مغرب کے لیے کسی خطرے کا موجب نہ رہیں گی۔

- ان ممالک میں رائے عام کو کبھی پروان نہ چڑھنے دیا جائے بلکہ سخت گیر آمروں کو عوام کا ہیرو بنا کر ان کی گردنوں پر مسلط کیا جائے اور انہیں اس بات کی شہ دی جائے کہ وہ عوام کے منشا اور مرضی کے خلاف زبردستی اُن پر مغربی الحاد ٹھونسیں یا اشتراکیت۔ چونکہ اشتراکیت سرمایہ داری کی نسبت ابھی زیادہ انقلاب انگیز قوت ہے اس لیے جو لوگ سوشلزم کا نعرہ بلند کریں اُن کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی جائے۔
- دنیائے اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے مسلم ریاستوں میں قومیت پرستی کی تحریک کو ابھارا جائے۔
- مسلمان ممالک کو معاشی اعتبار سے اس قدر مفلوج کر دیا جائے کہ اپنے وسائل کے بل بوتے پر نہ تو انہیں جینے کی ہمت ہو سکے اور نہ ایسا کرنے کے انہیں ڈھنگ ہی آئیں۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں مشرق وسطیٰ کی اس کشمکش کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کشمکش کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان ممالک مغرب کے ان ناپاک عزائم کو اچھی طرح سمجھتے اور انہیں ناکام بنانے کے لیے سر توڑ کوشش کرتے۔ لیکن افسوس کہ جس دام میں انہیں مغرب کے شکاری لانا چاہتے تھے وہ ہنسی خوشی اس میں آگئے اور سارے وہ کام کیے جو انہیں اپنی تعمیر و ترقی کی طرف لے جانے کی بجائے تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والے تھے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آدمی دنیا میں ہر چیز کا سامنا کر لیتا ہے مگر حقیقت، آئینہ اور ضمیر کا سامنا نہیں کر سکتا۔ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنا جائزہ یا اپنا احتساب ہے۔ گریبان میں منہ ڈالنا کوئی دلچسپ مشغلہ نہیں بلکہ یہ ایک بڑی ہی دشوار اور کٹھن منزل ہے جس سے بڑے بڑے لوگ کانپ اٹھتے ہیں۔ انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں اور بربادیوں کو دوسرے کے سر تھوپ کر بری الذمہ ہونا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خارجی عوامل کسی فرد یا قوم کو بسا اوقات شدید نقصان پہنچا دیتے ہیں لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ عوامل اُسی صورت میں زیادہ مؤثر ہوتے ہیں جب داخلی کمزوریوں نے کسی فرد یا قوم کے قویٰ کو بالکل مضمحل کر دیا ہو۔ یہی بات مشرقِ وسطیٰ کی اس بربادی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ نے بلاشبہ حق و انصاف کا خون کیا ہے۔ روس نے بلاریب عین وقت پر غداری کی ہے۔ اسرائیل نے یقیناً بڑی سفاکی اور درندگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن کیا یہ مسلمان ممالک اپنے ضمیر کے سامنے اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس بربادی میں ان کا اپنا کوئی حصہ نہیں اور یہ سراسر غیروں کی زیادتیوں اور ریشہ دوانیوں ہی کا نتیجہ ہے؟ بیرونی سازشیں کسی فرد یا قوم کا بال تک بیکا نہیں کر سکتیں اگر اُس کے داخلی حالات اُن سازشوں کے لیے سازگار نہ ہوں۔

اِس بربادی پر جس قدر تبصرے بھی دیکھنے میں آئے ہیں اُن میں شاہ مراکش کا تبصرہ ہمیں سب سے زیادہ صحیح، مناسب اور حقیقت افروز معلوم ہوا ہے جس میں انہوں نے کھل کر کہا ہے کہ:

"عربوں کو مشرقِ وسطیٰ کی جنگ میں اپنے نفاق، غلط کاریوں اور گناہوں کے باعث شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ خدا نے ہمیں ہمارے اعمالِ بد کی سزا دی ہے اور ہمیں خبردار کیا ہے کہ اگر ہم آپس

میں متحد نہ ہوتے اور ایک دوسرے کی تذلیل سے باز نہ آئے تو اس کا نتیجہ بجز تباہی و بربادی کے اور کچھ نہ ہوگا۔ چونکہ ہم میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی اس لیے ہمیں دشمن کے مقابلے میں ناکامی ہوئی۔ ارشادِ خداوندی یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے پر کیچڑ نہ اُچھالیں۔ لیکن اس کے برعکس ہم زبان اور تحریر کے ذریعے بارہا ایک دوسرے کی توہین کے مرتکب ہو چکے تھے۔ ارشادِ ربانی یہ تھا کہ ہم اس کے فرمانوں سے روگردان نہ ہوں اور اپنا ضابطۂ حیات اس کی ہدایات کے مطابق مرتب کریں مگر ہم نے خدا کے اس حکم کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ ہم اللہ سے اپنے رشتے توڑ چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس نے بھی ہم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے۔"

قرآن و سنت کے مطالعہ اور گذشتہ اقوام کے حالات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ دنیا میں قوموں کی عزت و سربلندی اور ذلت و رسوائی کے کچھ اصول ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا اصول یہ ہے کہ غیور اور قادرِ مطلق ذات نے جب چاہا انتہائی کمزور اور بے سہارا لوگوں سے اپنے دین کی خدمت کا کام لے لیا۔ لیکن اُس نے اپنے نام لیواؤں کو کبھی بھی دین کا باغی بن کر دنیا میں پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ جن قوموں نے اس کے دین سے یکسر انحراف کر کے اپنی زندگی کی تعمیر خالص کفر و انکار کی بنیادوں پر کی اُن کے لیے تو اس کی سنت یہ رہی ہے کہ دنیا کی جو قوم بھی مادی اسباب کی فراہمی، حالات کے مطالعہ میں تدبر و تفکر، اور افراد کے مابین اتفاق و اتحاد اور ضبط و نظم میں دوسروں پر جس قدر سبقت لے جاتی ہے وہ ان قوموں پر غالب آجاتی ہے جو کفر میں یکساں ہوں مگر ان صفات میں اس سے کم تر ہوں۔ البتہ وہ قومیں جو اس کے دین کی سچے دل سے مطیع و پیرو اور خادم و علمبردار ہوں اُن کے لیے اس کا خاص ضابطہ یہ رہا ہے کہ مادی اسباب و وسائل کی کمی کا تدارک وہ بسا اوقات اپنی تائیدِ خاص سے کر دیتا ہے اور بے سروسامانی کے باوجود انہیں دین کے دشمنوں پر فتح عطا فرماتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ اُس نے اپنے نام پر کبھی دنیا میں کھوٹے سکوں کو چلنے نہیں دیا ہے۔ کوئی قوم مسلمان ہونے کے باوجود نہ اسلام کی پیروی

کرے، نہ اسلام کے لیے کام کرے، اور پھر مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے بھی ہر طرح کفار کے مقابلہ میں ہیٹی رہے، تو آخر اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اسے اپنی تائیدِ خاص سے نوازے؟

ہم جب ان دونوں اصولوں کے تحت مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔ ہمارے لیے ان دردانگیز حالات کو دُہرانا بہر حال کوئی خوشگوار کام نہیں ہے۔ یہ اپنے ہی زخموں کے ٹانکے کھولنا ہے۔ مگر انہیں بیان کرنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہماری قوم حقائق کو پہچان سکے اور اُس سے جو کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں اُن کی اصلاح کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرے۔ اُس فوج کے جیتنے کے کوئی امکانات نہیں ہوتے جو میدانِ جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد اپنے مورچوں، اپنے اسلحہ اور اپنی جنگی مہارت کا جائزہ لے کر ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ان کے ذکر پر اُلٹا بُرا ماننے لگے۔

ہم سب سے پہلے دینی نقطۂ نظر سے ان ممالک کے حالات پر غور کرتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے سارے ممالک میں اس وقت سب سے زیادہ طاقتور مصر ہے لیکن اس بدنصیب ملک کے فرمانرواؤں نے گزشتہ چند سالوں سے اسلام کا حلیہ بگاڑنے اور اس کی جگہ غیر اسلامی تہذیب کو فروغ دینے اور غیر اسلامی نظریات کو باہر سے لاکر ایک مسلم معاشرے پر مسلط کرنے کے لیے جو ظلم و زیادتی کی ہے، پوری دنیا اس کی شاہد ہے۔ اس شخص نے ہر وہ کام کیا جو خدا کی رحمت کو دعوت دینے کے بجائے اُس کے غضب کو انگیخت کرنے والا تھا۔ اُس نے اسلام کے وسیع اور ہمہ گیر رشتۂ اخوت کو توڑ کر عرب قومیت کا نعرہ بلند کیا۔ قرآن حکیم نے ہمیں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی ہے کہ وللہ العزۃ ولرسولہ لیکن اس شخص نے رسول کی جگہ عرب قومیت کو دے دی اور یہ کہنا شروع کیا العزۃ للّٰہ و للقومیۃ العربیۃ۔ بعض جگہ تو باری تعالیٰ کو بھی نظرانداز کر کے پوری قوم کو صرف عرب

قومیت کا بُت پُوجنے کی تلقین کی۔ خدا اور اُس کے رسُول سے بغاوت میں وہ اور اس کے اعوان اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے کہ اسرائیل اور عربوں کے مابین تصادم کے دنوں میں بھی ان لوگوں کے جو بیانات، خطبات اور تقاریر ریڈیو پر نشر کی جاتی تھیں ان میں خدا اور رسول یا دین اسلام کا نام تک نہ آتا تھا۔ عرب قومیت، عرب وطنیت، عرب افواج اور عرب وسائل ہی کا وظیفہ بار بار پڑھا جاتا تھا اور اس سے بڑھ کر یہ ایک خطبہ کا افتتاحی جملہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی جگہ باسم القومیۃ العربیۃ اور باسم الکرامۃ العربیۃ تھا

اب جبکہ مصر اور تمام مشرقِ وسطیٰ نے اس جنگ میں زبردست زک اٹھائی ہے، پھر بھی اس شخص کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ اس نے اس سانحہ کے بعد اپنا استعفا پیش کرتے ہوئے جو پہلی تقریر نشر کی ہے اُس میں بھی عرب قوم پرستی کا بار بار تذکرہ ہے۔ اور جن باتوں کی طرف اُس نے قوم کی توجہ دلائی ہے ان میں سب سے اہم تین باتیں ہیں۔

- عرب مفادات اور عربوں کے حقوق کا تحفظ ہمارا نصب العین ہے۔
- عرب اتحاد کی توقع اس وقت بھی مثل شمع فروزاں رہے گی جب جمال عبدالناصر یہاں نہ ہوگا۔
- عرب سوشلزم بدستور برقرار رہے گا۔

یہ عرب قوم پرستی اور عرب سوشلزم کی تحریک درحقیقت اسلام کی بیخ کنی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ بیخ کنی بجائے خود ان کی مقصود ہو یا نہ ہو، اس کا نتیجہ بہر حال یہ ہے کہ عربوں کا دینی رشتہ دنیائے اسلام سے کٹ جائے اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم دین محمدؐ کے بجائے دین مارکس کی پیرو بن جائے۔ ناصر صاحب نے کئی مرتبہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں علانیہ یہ کہا ہے کہ وہ عرب ریاستوں کو اشتراکی ریاستیں بنانے کا عزم بالجزم کر چکے ہیں۔ اس کے لیے زمین ہموار کرنے کی غرض سے انہوں نے لوگوں کے

دینی احساسات کو کچلنے میں کبھی دریغ نہیں کیا اور اُن تمام عناصر کا قلع قمع کرنے میں اپنا پورا زور صرف کر دیا جن کی وجہ سے ان احساسات کے زندہ رہنے کے امکانات موجود تھے۔ اس ضمن میں ناصر صاحب کے بعض کام تو ایسے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً فراعنہ کے لاتعداد بُت بنوا کر انہیں اہم مقامات پر نصب کرنا۔ نوٹوں اور ٹکٹوں پر فراعنہ کی تصویریں چھاپنا۔ نحن ابناء الفراعنہ کا نعرہ لگانا۔ گزشتہ سال جب مصر کے مالی حالات کی رپورٹ دنیا کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تو اس میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بتایا گیا تھا کہ مصری دولت کا ایک معقول حصّہ فراعنہ کے بتوں کی نذر ہو رہا ہے۔ آپ مصر کے کسی دفتر میں چلے جائیے۔ آپ کو فرعون رعمسیس کی تصویر صدر ناصر کی تصویر کے پہلو میں آویزاں نظر آئے گی۔ اور یہ فرعون رعمسیس وہی ہے جسے خود مصری مورخین بھی مانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دینے کا حکم اسی نے دیا تھا جس کی مذمت قرآن مجید میں وارد ہوئی ہے۔

مصر کے مدارس کے لیے جو نیا نصاب مرتب کیا گیا ہے اُس میں نوخیز نسلوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو اسلام کے مطابق بنانے کے بجائے انہیں مغرب کے ملحدانہ نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوششیں کی گئی ہیں۔ قلب و نگاہ کی یہ تبدیلی صرف مغربی طرز کے مدارس تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے مسموم اثرات اُن تعلیمی مراکز میں بھی پوری طرح نمایاں ہونے لگے ہیں جو کبھی دینی تعلیم کے گہوارے تھے اور جہاں نوجوان تعلیم و تربیت حاصل کر کے دین کے مبلغ اور معلم اور خطیب و واعظ بنتے تھے۔ مصر کی سب سے قدیم یونیورسٹی جامعہ ازہر تک کے نصاب میں اسلامی نقطۂ نظر سے بعض ایسی تبدیلیاں کی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ کام کبھی دین سے کوئی معمولی تعلق رکھنے والا بھی کر سکتا ہے۔ جو لوگ اب یہاں سے تحصیل علم کر کے نکلتے ہیں انہیں اپنے مسلمان ہونے پر ناز کرنے کے بجائے فراعنہ کی اولاد

ہونے پر فخر ہوتا ہے اور وہ بڑے طمطراق سے کہتے ہیں "نحن ابناء فرعون"۔
پھر اس خطّہ کی سب سے بڑی دینی تحریک، جسے ہم مشرقِ وسطیٰ کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ سمجھتے ہیں اور دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں کہ یہ محض ایک تحریک نہ تھی بلکہ عرب ملکوں کے لیے اللہ کی رحمت تھی جس سے باری تعالیٰ نے اس خطّے کو نوازا تھا، اس کا جو حشر ناصر صاحب کے ہاتھوں ہوا وہ ہمارے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا دینی المیہ ہے۔ اس تحریک کے جاں نثاروں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے اُس کی یاد سے آج بھی جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ کیا کوئی حکمراں اپنی بے بس رعایا پر کبھی اس قسم کے مظالم بھی ڈھا سکتا ہے۔ لیکن ناصر صاحب نے اشتراکیت کی اندھی محبّت میں آنکھیں بند کر کے اس زبردست اسلامی تحریک کو بڑے جبر و استبداد کے ساتھ برباد کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مصر میں بلکہ دوسرے عرب ملکوں میں بھی کوئی گروہ ایسا باقی نہ رہا جو اس جنگ کے موقع پر اپنی قوم میں دینی جذبہ و جوش اُبھارتا اور روحِ جہاد بیدار کرتا۔ غضب یہ ہے کہ نہ جنگ سے پہلے اخوان کو رہا کیا گیا، نہ جنگ کے زمانے میں، اور نہ جنگ کے بعد۔

دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی ناصر صاحب کے کسی فعل کو شاید ہی دانشمندانہ کہا جا سکتا ہو۔ اس شخص کے دل میں صرف ایک ہی امنگ تھی کہ کسی طرح پورے مشرقِ وسطیٰ میں اُسے بلا شرکتِ غیرے قیادت کا مقام حاصل ہو اور تمام عرب ریاستیں اس کی تابع فرمان ہوں۔ اس شخص نے کبھی اپنے بھلے اور بُرے میں تمیز کرنا نہیں سیکھا۔ اپنے دوستوں کو پہچاننے اور اپنے دشمنوں سے محتاط رہنے میں یہ ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ سب سے پہلے اس نے عرب دنیا کے باہر مسلمان ممالک کی مخالفت کی اور اس کے دشمنوں کا ساتھ دیا۔ مثلاً دیکھیے۔ اس نے قبرص میں ترکوں کی حمایت کرنے کے بجائے ظالم مکاریوس کی صرف اخلاقی ہی نہیں بلکہ عملی تائید بھی کی۔ حالانکہ خالص نسلی اور مذہبی تعصب کی بنا پر وہ مسلمان ترکوں پر بدترین مظالم ڈھا رہا تھا۔ تاہم

ترکوں کے متعلق وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ عربوں کے مفاد سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے لیکن پاکستان، جس نے اپنے قیام کے بعد سے آج تک ہمیشہ ہر عربی قضیے میں سب سے آگے بڑھ کر عربوں کی حمایت و وکالت کی ہے، اور جس کا خود عربوں نے بارہا اعتراف کیا ہے، اس کے مقابلے میں بھی اس شخص نے ہمیشہ بھارت کو ترجیح دی اور کشمیر کے مسئلہ میں، جس میں پاکستان سراسر حق پر ہے، کبھی ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ کوئی شخص اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک کلمہ بھی پیش نہیں کر سکتا جو اس نے کشمیریوں کی آزادی کے حق میں کبھی کہا ہو۔ پھر عرب لیڈروں اور فرمانرواؤں میں سے بھی جس کسی نے اس سے ذرہ برابر اختلاف کیا اُس کے لیے اس کی زبان سے اور اس کے ریڈیو اور پریس سے گالیوں کے سوا اور کوئی چیز کبھی سننے میں نہ آئی۔ موجودہ بحران سے ایک روز پہلے تک اس کی طرف سے سعودی عرب، اردن، اور تونس کو بُرا بھلا کہا جاتا رہا۔ سعودی عرب کے حکمران کو ابو ذقنہ (ڈاڑھی والا)، تونس کے سربراہ کو ابن الیہودیہ (یہودی عورت کا بچہ) اور اردن کے فرمانروا کو سلالۃ الشیطان (شیطان کی اولاد) کے القاب سے نوازا جاتا رہا۔

پھر اس شخص نے روسی امداد کے بل بوتے پر ۱۹۶۳ء سے یمن پر چڑھائی کر رکھی ہے اور وہاں چار سال سے ۵۰-۶۰ ہزار مصری فوج خود اپنے عرب (مسلمان) بھائیوں کے ساتھ برسرِپیکار ہے۔ اس جنگ میں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں عرب (مسلمان) مارے گئے ہیں اور دولت کا جو ضیاع ہُوا ہے اس کا اندازہ کروڑوں نہیں بلکہ اربوں پونڈ تک پہنچ گیا ہے۔ مسلسل چار سال کی اس جنگ نے مصر اور یمن کی معیشت بالکل تباہ کر دی، جزیرۃ العرب کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک دیا، مصر کی فوجی طاقت کو اس قدر کمزور کر دیا کہ اس میں اسرائیل سے ٹکر لینے کی سکت نہ رہی، اور غضب یہ ہے کہ اسرائیل کے حملہ کے وقت تک ۵۰ ہزار مصری فوج یمن میں پڑی رہی۔ اپنی اس حماقت کے لیے کوئی دلیلِ جواز نہ ناصر صاحب پیش کر سکتے ہیں نہ وہ لوگ جو ان کے حامی بنے پھرتے ہیں۔ یہ اسی یمنی مہم کا نتیجہ ہے کہ مصر کو روس اور اُس کے ہم خیال ملکوں سے بے تحاشا امداد لینی پڑی ہا اور مصر ان کا اتنا زیر بارِ احسان ہو گیا کہ اسرائیل سے جنگ کے موقع پر روس نے جو بے وفائی کی اس پر ناصر صاحب ایک حرفِ شکایت بھی زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس وقت مصر کی معاشی حالت یہ ہے کہ

اس کی روئی اور سویز کی پوری آمدنی روس کے ہاتھ میں رہن ہے۔

مصر کے بعد مشرقِ وسطیٰ کا دوسرا طاقتور ملک شام ہے۔ اس بدنصیب ملک پر اس وقت بعث پارٹی کی حکومت ہے۔ یہ پارٹی ۱۹۶۳ء سے تمام دوسری پارٹیوں کو ختم کرکے شام کی عنانِ اختیار سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ بھی قومیتِ عربیہ اور اشتراکیت کی علمبردار ہے۔ اس پارٹی کو ابتداءً چار قسم کے عناصر وجود میں لائے تھے۔ عیسائی عرب۔ ملحدانہ رجحانات رکھنے والے مسلمان۔ دروزی۔ اور علوی۔ اسلام کی مخالفت میں یہ چاروں متفق تھے۔ اوّل اوّل انہوں نے اُن ملحدین کو آگے رکھا جو اہلِ سنت سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً امین الحافظ اور صلاح بیطار جیسے لوگ۔ پھر دروزیوں اور علویوں نے ان کو بھی نکال باہر کیا اور یہ دونوں مل کر ملک پر قابض ہوگئے۔ اس کے بعد خود ان دونوں میں بھی چل گئی اور علویوں نے دروزیوں کو (جن کا لیڈر سلیم حاطوم تھا) حکومت سے بے دخل کردیا۔ اس وقت ملک تنہا علوی فرقے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ علوی اور دروزی وہی فرقے ہیں جو اسلامی تاریخ میں نُصیریہ اور قرامطہ کے نام سے معروف ہیں۔ اب نُصیریہ کو علوی کہا جانے لگا ہے اور قرامطہ کے بقایا پر دروزی کے نام کا اطلاق ہوتا ہے۔ چونکہ فوج اور نظم ونسق پر اس وقت علویوں کا قبضہ ہے اس لیے شام کی عام مسلمان آبادی ان کے ہاتھ میں بے بس ہے۔ الحاد اور اشتراکیت کو زبردستی اس پر مسلط کیا جارہا ہے۔ اور اس کی ہر مزاحمت کو توپ و تفنگ کی طاقت سے دبایا جاتا ہے۔

اس محدود سی اقلیت کو حکمرانی کرنے کے لیے اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ کوئی بیرونی قوت اس کی پشت پناہی کرے۔ رُوس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور دستِ اعانت بڑھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک شام اشتراکیت کی گود میں چلا گیا۔ اس پارٹی نے ۱۹۶۵ء میں دمشق کی تاریخی مسجد جامع اموی پر گولہ باری کی حمص اور حماہ کی

مسجدوں میں گھس کر نمازیوں پر فائرنگ کی ۔بکثرت مسلمان علماء اور لیڈروں اور بااثر لوگوں کو قید کیا جا چکا ہے ، ان کی جائدادیں ضبط کی گئی ہیں اور بہت سے لوگوں کو ملک چھوڑ کر نکل جانا پڑا ہے۔ یہ سلسلہ موجودہ جنگ کے آغاز تک چلتا رہا ہے ۔اب جنگ کے بعد امین الحافظ اور اس کے بعض ساتھیوں کو تو چھوڑ دیا گیا ہے ۔لیکن جو علماء اور دوسرے مسلمان جیلوں میں تھے ان کی رہائی کی کوئی خبر دنیا نے اب بھی نہیں سنی ہے ۔

یہ بعث پارٹی اسلام کے بارے میں کیا احساسات اور خیالات رکھتی ہے اس کا اندازہ اس کے سرکاری ترجمان "جیش الشعب" (قومی فوج) کے ایک مضمون سے لگایا جا سکتا ہے جس کے چند فقرے یہ ہیں :

" اسلام اور مسیحیت کی قدروں نے عرب انسان کو ذلیل اور توکل پرست بنا دیا جو صرف یہ کہنا جانتا ہے کہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

عرب تہذیب کی تعمیر جدید اور عرب سماج کی تشکیلِ نو کا واحد راستہ یہ ہے کہ ایک جدت پسند انقلاب پرست اشتراکی انسان کو جنم دیا جائے جس کا پختہ ایمان ہو کہ خدا ، دین ، سرمایہ داری ، جاگیرداری ، سامراج اور وہ تمام قدریں جو آج تک سماج پر چھائی ہوئی ہیں محض حنوط شدہ پتلے ہیں جنہیں تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بنا دینا چاہیے ہمیں ایسے انسان کی ضرورت نہیں ہے جو نمازیں پڑھتا ہو ذلیل اور عاجز بنکر رکوع میں جھکا رہتا ہو ۔ اپنے لیے رحم اور مغفرت کی دعائیں کرتا ہو ۔ ۔ ۔ ہم جس انسان کے ضرورتمند ہیں وہ اشتراکی اور انقلاب پسند انسان ہے جو انسان کو حقیقتِ مطلقہ سمجھتا ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو ۔"

یہ مضمون ٹھیک اس زمانے میں شائع کیا گیا جب اسرائیل کا طوفان عرب ممالک کے سر پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تُلا کھڑا تھا ۔جس وقت یہ مضمون شائع ہوا پورے شام میں اس پر شدید احتجاج کیا گیا اور اس پر ایک ہفتہ تک ہڑتال جاری رہی ، مگر معقولیت کے ساتھ کوئی بات

ماننے اور تسلیم کرنے کی جگہ احتجاج کرنے والوں کو سختی سے دبانے کی بھرپور کوشش کی گئی، بڑے بڑے علماء کو گرفتار کیا گیا، احتجاج اور ہڑتال کرنے والوں کو پکڑا گیا، بہت سے لوگوں کی جائدادیں ضبط کرلی گئیں، اور الزام لگایا گیا کہ یہ سب استعمار کے ایجنٹ ہیں۔

یوں اس جنگ سے ایک روز پہلے تک شام کی مسلّح افواج اپنے بھائیوں کو ہی تہس نہس کرنے میں سرگرم عمل تھیں۔ جس طرح مصر اپنی ساری طاقت اخوان کو کچلنے اور گردوپیش کی عرب ریاستوں کو اپنے زیر اثر لانے اور یمن کو سرنگوں کرنے میں صرف کرتا رہا بالکل اسی طرح شام کی حکمراں پارٹی اپنی ساری قوت دینی عناصر کو دبانے اور اہلِ شام پر الحاد و اشتراکیت کو زبردستی مسلط کرنے میں کھپاتی رہی۔ اور روس اس اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں ملکوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتا رہا۔ اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ روس کی معاونت اور دستگیری اور اس کی براہِ راست نگرانی کے بغیر شام کی حکومت تو زندہ ہی نہیں رہ سکتی اور مصر بھی اپنے بل بوتے پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔

شام سے متصل دوسرا چھوٹا سا ملک اُردن ہے۔ اس ملک کے باشندوں میں اگرچہ جینے کا عزم اور حوصلہ موجود ہے اور وہ اپنے تحفظ کے لیے اپنی جانوں پر کھیلنا بھی جانتے ہیں، جیسا کہ انہوں نے موجودہ جنگ میں ثابت کردیا ہے۔ مگر شام اور مصر کی طرف سے اُس کے داخلی معاملات میں ایک مدت سے مسلسل مداخلت کی جاتی رہی، اس کے حکمران کو استعمار کا ایجنٹ قرار دیا جاتا رہا اور حالیہ جنگ سے چند روز پہلے تک اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ ان وجوہ سے یہ ملک سازشوں کا اڈہ بن گیا تھا اور اس کے سربراہ کی ہمت و جرأت کے باوجود اس کے وسائل کا زیادہ حصہ اس اندرونی خلفشار کی روک تھام میں صرف ہوتا رہا۔ حد یہ ہے کہ محاذ آزادیٔ فلسطین کے لیڈر احمد شقیری صاحب بھی فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرانے کی بہ نسبت شاہ حسین کے اقتدار کا تختہ اُلٹنے کو مقدم سمجھتے رہے (باقی ص۵۵ پر)